باب چہارم

کون سا اِسلام؟

گزشتہ مباحث سے یہ بات اظہر من الشّمس ہوچکی ہے کہ پاکستان پوری دنیا کا وہ واحد ملک ہے جس کی ''ولدیت'' صرف اور صرف اسلام ہے۔ چنانچہ یہ قائم بھی دین و مذہب کے نام پر ہوا اور اس کے بقاو دوام اور ترقی و استحکام کے لیے بھی نہ تاریخی تقدس کا عامل موجود ہے، نہ فطری جغرافیائی حدود کا حفاظتی ذریعہ اور نہ ہی دنیا کے معروف اور مروجہ معیارات کے مطابق کوئی قوم پرستانہ جذبہ۔ بلکہ اُسے مضبوط اور مستحکم اور ناقابل تسخیر بنا سکتا ہے تو صرف اور صرف مذہبی جذبہ۔ تو آیئے کہ اب ہم اُس مذہبی جذبے کی نوعیت اور خدوخال معین کرنے کی کوشش کریں جو پاکستان کے بقا و استحکام کی مضبوط اور پائیدار اساس بن سکتا ہے، اور یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ اسلام کی کون سی تعبیر اُس مذہبی جذبے کی پیدائش و افزائش کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

1- قومی و نسلی نہیں بلکہ حقیقی اور عملی

اس ضمن میں اوّلین اور اہم ترین حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ کہ وہ مذہبی جذبہ جو پاکستان کے بقا و استحکام کا ضامن بن سکتا ہے بنیادی طور پر مختلف ہے اُس مذہبی جذبے سے جو اُس کے وجود میں آنے کا سبب بنا تھا، اِس لیے کہ اُس وقت مقابلہ غیر مسلموں سے تھا۔ لہٰذا ہر وہ شخص جو مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوا اور مسلمانوں کا سا نام رکھتا تھا، قومی تحریک میں نہ صرف شامل اور شریک ہوسکتا تھا، بلکہ اُس کے قائدین تک کی صفوں میں بار پا سکتا تھا، قطع نظر اِس سے کہ اُس کے واقعی نظریات کیا تھے، اُس کے اخلاق اور کردار کا عالم کیا تھا اور وہ اسلام کے بنیادی احکام تک پر عمل پیرا تھا یا نہیں؟ حتیٰ کہ ارکانِ اسلام تک کا بھی پابند تھا یا نہیں؟ چنانچہ اُس وقت ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ'' کے بعد سب سے زیادہ مقبول نعرہ یہی تھا کہ ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ''

واقعہ یہ ہے کہ اُس وقت کی کشمکش میں ہمارے اندر اپنے مسلمان ہونے کا احساس زیادہ شدت کے ساتھ خود ہندوؤں کے طرزِ عمل اور رویے کے باعث پیدا ہو رہا تھا کہ جہاں کسی مسلمان کا ہاتھ اُن کے برتن کو چھو گیا وہ ''بھرشٹ'' یعنی ناپاک ہوگیا۔ خواہ وہ مسلمان کتنا ہی صاف ستھرا اور نہایا دھویا کیوں نہ ہو، اور وہ ہندو خود کتنے ہی گندے اور میلے کچیلے کیوں نہ ہوں۔ چنانچہ ہر ریلوے سٹیشن پر پینے کا پانی بھی اِس شان سے جدا تھا کہ اگر ''مسلمان پانی'' پلیٹ فارم کے ایک سرے پر ہوتا تھا تو ''ہندو پانی'' اُس کے بالکل بالمقابل دوسرے سرے پر۔ پھر خاص طور پر معاشی و اقتصادی میدان میں ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں پر جس طرح عرصۂ حیات تنگ کرنے کی کوششیں ہو رہی تھیں، اُن کی چبھن اور کسک کو ہر مسلمان تاجر، یہاں تک کہ کھوکھے والے اور خوانچہ فروش تک اور جملہ سرکاری ملازم یہاں تک کہ چوکیدار اور چپڑاسی تک محسوس کر رہے تھے۔ گویا کہ اُس وقت کے مسلم نیشنلزم میں جہاں مثبت اور حقیقی عوامل بھی کارفرما تھے، وہاں ایک اہم اور مؤثر عنصر ابنائے وطن کے رویے کا ردّ عمل (Reaction) بھی تھا۔

اس ضمن میں نومبر ۱۹۲۵ء میں علماء ہند کے دوسرے کل ہند اجلاس کے موقع پر اپنے خطبہ صدارت میں جو کچھ فرمایا تھا مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ اور مربی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ نے، اس کا مطالعہ بہت مفید اور بہت سوں کے لیے ''انکشاف حقیقت'' کا ذریعہ بنے گا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا تھا۔

’’ہاں یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائیدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اُن کی حدود کو خوب اچھی طرح دلنشیں کر لیجیے۔ اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں اُن سے کوئی رخنہ نہ پڑے، جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی طریقہ ایسا نہ اختیار کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری مقصود ہو۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اِس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت سے لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں، لیکن محکموں اور ابوابِ معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔ میں اِس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں، بلکہ میری گزارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اُٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیوشنوں کی تعداد سے دھوکا نہ کھانا چاہئے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے اور ان کو ہندو مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصّبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہئے۔‘‘[1]

[1] بحوالہ ’’بیس بڑے مسلمان‘‘ تالیف مولانا عبدالرشید ارشدؔ‘‘ ص ۲۹۱

ذرا اندازہ فرمایئے حضرت شیخ الہندؒ کی دُور اندیشی اور ژرف نگاہی کا کہ یہ ۱۹۲۰ء کا دَور ہے۔ جب کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان بظاہر شیر و شکر ہیں اور تحریکِ آزادی میں قدم بہ قدم اور شانہ بہ شانہ شریک ہیں۔ اور خود محمد علی جناح جو اُس وقت تک ’’قائدِاعظم‘‘ نہیں بنے تھے، ہندو مسلم اتحاد کے سفیر اور محبت و یگانگت کے سب سے بڑے داعی اور علمبردار ہیں، لیکن وہ مردِ درویش اُس ظاہری رواداری کے پردے میں ہندو کی اصل ذہنیت کا اندازہ کر چکا ہے اور واضح اور غیر مبہم الفاظ میں تنبیہہ کر رہا ہے کہ اگر برادرانِ وطن کا رویہ یہی رہا تو ہمیں بھی اپنے طرزِ عمل پر نظرِ ثانی کرنی ہوگی۔

اس کے فوراً بعد آتا ہے تحریکِ خلافت کا طوفانی اور ہیجانی دَور جس میں ہندوؤں کو مسلمانوں کا حاشیہ بردار اور تابع (Camp Follower) بننے ہی میں عافیت نظر آتی ہے۔ چنانچہ اُس جذباتی اور ہنگامی دور میں تو مسلمان اور ہندو واقعتاً شیر و شکر نظر آتے ہیں۔ لیکن جب تحریکِ خلافت دفعتاً بالکل اُسی انداز میں ختم ہو جاتی ہے جیسے تیز بخار پسینہ آنے سے یکدم اُتر جاتا ہے تو صورتِ حال میں ایک فوری تبدیلی آتی ہے کہ ایک جانب مسلمانوں میں شدید دل شکستگی کی کیفیت پیدا ہوئی، اُن کے ولولے سرد پڑے اور ایک عام بددلی اور مایوسی کی فضا طاری ہوگئی، اور دوسری جانب (غالباً مسلمانوں کی اِس عمومی کیفیت ہی سے حوصلہ پا کر) ہندو و ذہنیت کھل کر سامنے آئی۔ چنانچہ کہیں اُس نے ’’شدھی اور سنگھٹن‘‘ کا روپ دھارا تو کہیں ’’واردھا اسکیم‘‘ کی صورت اختیار کی، اور کہیں ’’ہندو مہا سبھا‘‘ کی شکل میں ظہور کیا تو کہیں راشٹریہ سیوک سنگھ کی صورت میں جلوہ گر ہوئی۔ نتیجتاً ہندوستان میں ہندو مسلم کشمکش کے شدید ترین دَور کا آغاز ہوگیا اور مسلم قوم پرست تحریک اپنے نقطۂ عروج کی جانب تیزی کے ساتھ منزلیں طے کرتے ہوئے بڑھنے لگی۔ اِس طرح کم از کم مسلمانانِ ہند کے ضمن میں ہندو کی تنگ نظری اور استحصالی ذہنیت کے بارے میں وہ بات کمالِ صداقت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے، جو علامہ اقبال نے یورپی استعمار کے بارے میں کہی تھی: ع

’’مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے!‘‘

اور قیامِ پاکستان کی ضمن میں ہندوؤں کے اِس طرزِ عمل پر بجا طور پر اُن کا شکریہ ادا کیا جا سکتا ہے کہ ؎

تو نے اچھا ہی کیا دوست سہارا نہ دیا
مجھ کو لغزش کی ضرورت تھی سنبھلنے کے لیے

بہرحال اِس گھمسان کے رَن میں ظاہر ہے کس کے پاس فرصت تھی اور کسے ہوش تھا کہ یہ دیکھے کہ کون اسلام پر واقعتاً عمل پیرا ہے اور کون اُس کے کم ازکم لوازم وشرائط پر بھی پورا نہیں اُترتا۔ اُس وقت تو واحد امتیاز کلمۂ شہادت کا تھا کہ کون کلمہ گو ہے اور کون نہیں! چنانچہ تحریک پاکستان کی اساس مسلم قومیت قرار پائی نہ کہ اسلام کے ساتھ واقعی اور عملی تعلق، اور یہ ہتھیار واقعتاً اُس وقت بہت کارگر اور مؤثر ثابت ہوا۔ چنانچہ اُسی کی اساس پر تحریک نے عوامیت اختیار کی اور کامیابی حاصل کرلی اور قیام پاکستان کا ''معجزہ'' ظہور میں آ گیا۔

تقسیم کے بعد حالات یکسر تبدیل ہوگئے۔ مغربی پاکستان میں ہندو نہ ہونے کے برابر رَہ گئے اور جو رہ گئے انہوں نے بھی کم ازکم وقتی طور پر گویا دم سادھ لیا۔ چنانچہ ہندو مسلم کشمکش مغربی پاکستان کی حد تک بالکل ختم ہوگئی۔ رہے بھارت کے حالات تو وہ بین الاقوامی سرحدوں کے پردوں میں چھپ کر'' آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل'' کے مصداق بن گئے۔ نتیجتاً جب تک تقسیم کے وقت کے زخموں میں ٹیسیں اُٹھتی رہیں اور کسک باقی رہی سابقہ کشمکش کی یاد بھی برقرار رہی، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ اُس کے اثرات بھی زائل ہوگئے اور یاد بھی باقی نہ رہی۔ رہا مشرقی پاکستان تو وہاں اگرچہ ایک فعال اور مؤثر ہندو اقلیت قابل لحاظ تعداد میں موجود تھی، لیکن اُس نے کمال ہوشیاری اور چابکدستی سے کام لے کر وہاں کی مسلم اکثریت کے مسابقت اور مقابلے کے جذبے کا رُخ اپنی جانب سے پھر کر مغربی پاکستان کی طرف کر دیا اور خود خاموشی کے ساتھ ایک بغلی دشمن کے انداز میں ایک لسانی اور ثقافتی قومیت کے تصور کو اُبھارنے اور اُجاگر کرنے میں لگ گئے، جس کا نتیجہ پچیس سال کے اندر اندر پاکستان کی شکست اور بنگلہ دیش کے قیام کی صورت میں ظاہر ہوا، جس پر پاکستان اور نظریۂ پاکستان کے دشمنوں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلے اور انہیں یہ کہنے کا موقع ملا کہ دوقومی نظریہ باطل (False) ثابت ہوگیا ہے۔ اور اس کے بعد یہی طریق کار ــــــ (Strategy) ''بچے کھچے پاکستان'' میں چھوٹے صوبوں بالخصوص سندھ کی ہندو اقلیت اپنائے ہوئے ہے۔ چنانچہ اُس نے بھی سندھ کی قدیمی مسلمان آبادی کی اکثریت کی مخالفت اور نفرت کا رُخ پنجاب کی جانب موڑ کر خود ایک لسانی اور ثقافتی قومیت کے دامن میں پناہ لی ہوئی ہے اور بظاہر احوال تو یہی نظر آتا ہے کہ ''سندھو دیش'' کی تحریک بھی سندھ کی نوجوان نسل کے معتد بہ حصے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی ہے۔ واللہ اعلم۔

بنابریں اب وہ مسلم قوم پرستی جس کے شعور کی گیرائی و گہرائی میں ایک فیصلہ کن حصہ برصغیر کی ہندو مسلم کشمکش کی شدت کا تھا ایک مؤثر اور قابل لحاظ عامل کی حیثیت سے موجود ہی نہیں ہے۔ گویا مذہبی جذبے کی وہ قسم جو پاکستان کے قیام کا ذریعہ بنی تھی اب نہ صرف یہ کہ غیر مؤثر اور دُور راز کار ــــــ (Obsolete) ہوچکی ہے بلکہ فی الواقع موجود ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ پاکستان کی نئی نسل کو نہ صرف یہ کہ ہندو ذہنیت کا کوئی تجربہ نہیں ہوا، بلکہ اِس کے برعکس اُسے تو آئے دن محبت کے اُن ''زمزموں'' سے سابقہ پیش آتا ہے، جو سرحد پار سے ہوا کے دوش پر ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے پہنچتے رہتے ہیں یا جن کی یلغار مسلسل دانشوروں، شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں ــــــ اور سب سے بڑھ کر ثقافتی طائفوں کے ذریعے ہوتی رہتی ہے۔

صرف یہی نہیں، بلکہ اِس سے بڑھ کر یہ کہ اب پاکستان میں عمودی (Vertical) اور اُفقی (Horizontal) تقسیم اور محاذ آرائی (Polarisation) نے خود پاکستانی مسلمانوں کو باہم منقسم اور ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑا کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک جانب علاقائی، لسانی اور ثقافتی تقسیم کی گہرائی اور گیرائی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے تو دوسری جانب طبقاتی تقسیم کا شعور بھی رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہے۔ لہٰذا اب پاکستان کے مسلمانوں میں مقاصد کی یک جہتی اور ہم آہنگی صرف مسلم قومیت کے تصور اور محض قوم پرستانہ جذبے کی بنیاد پر پیدا نہیں ہوسکتی، بلکہ اب انہیں کوئی شے ''بنیان مرصوص'' (یعنی سیسہ پلائی ہوئی دیوار)[1] بنا سکتی ہے تو صرف وہ مذہبی جذبہ ہوسکتا ہے جو اُس اسلام کے ساتھ حقیقی تعلق اور کردار و عمل کے واقعی رشتے سے پیدا ہوا اور اُسی سے غذا حاصل کرے اور نشو ونما پائے۔

[1] سورۃ الصّف آیت نمبر ۴

یہی بات راقم نے ایک ملاقات میں پاکستان کے بزرگ صحافی جناب زیڈ اے سلہری سے عرض کی تھی کہ آپ کا تقریباً ہر مضمون ''دوقومی نظریئے'' (Two Nation Theory) پر مبنی ہوتا ہے، اور آپ کی ہر تحریر کی تان لازماً مسلم قومیت (Muslim Nationhood) پر ہی ٹوٹتی ہے ——— تو جہاں تک اِس حقیقت کا تعلق ہے کہ پاکستان اسی کی بنیاد پر قائم ہوا تھا تو میرے خیال میں کوئی نہایت ہی ڈھیٹ قسم کا انسان ہی ہوگا جو اِس سے انکار کی جرأت کرے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جس انداز سے آپ اس کی تکرار کر رہے ہیں اُس سے تو اُلٹا اِس شک کے پیدا ہونے کا امکان ہے کہ پاکستان کی ''ایجاد وتکوین'' (Genisis) کے ضمن میں کوئی اور دوسرا قوی تر نظریہ بھی موجود ہے جس کی اِس تکرار اور اعادے اور شدومد کے ساتھ نفی اور تردید کی ضرورت محسوس ہورہی ہے۔ اصل قابل غور اور اہمیت کی حامل حقیقت یہ ہے کہ محض مسلم قومیت اب پاکستان کے بقاء واستحکام کی ضامن نہیں بن سکتی، جب تک اُس میں حقیقت اور واقعیت کا رنگ نمایاں طور پر نظر نہ آئے اور فعل وعمل کی رُوح واضح طور پر جاری وساری محسوس نہ ہو۔

2- جدید دانشورانہ اسلام نہیں، بلکہ علماء کا مصدقہ اسلام!

دوسری اہم اور بنیادی بات جو اُس مذہبی جذبے کے بارے میں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئے جو پاکستان کے بقاء واستحکام کے لیے ٹھوس بنیاد بن سکے، یہ ہے کہ وہ اسلام کی کسی جدید دانشورانہ تعبیر کے ذریعے پیدا نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اُس کے لیے اسلام کی صرف وہی تعبیر مؤثر اور کارگر ہوگی جو صدیوں کے تعامل اور ''روایت'' کی بناء پر مسلمانوں کے ''اجتماعی شعور'' (Collective Consciousness) کا جزو لاینفک بن چکی ہے، اور جسے اُن علماء کرام کی تصدیق حاصل ہے جن پر دین ومذہب کے معاملے میں مسلمان عوام کی عظیم اکثریت اعتماد کرتی ہے۔ اس لیے کہ موضوع زیر بحث کے اعتبار سے ہم ایک ایسے جذبے کی بات کر رہے ہیں، جو عوام میں ذہنی، فکری اور جذباتی ہم آہنگی پیدا کرے اور اُن کو محنت ومشقت اور ایثار وقربانی پر آمادہ (Motivate) کر سکے اور ظاہر ہے کہ یہ مقصد کسی جدید تعبیر کے ذریعے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اِس لیے کہ جدید تعبیرات اور دانشورانہ تصورات تو زیادہ سے زیادہ ذہین اقلیت (Intellectual Minority)، بلکہ اُس کے بھی ایک حصے ہی کو متاثر کر سکتے ہیں، عوام کے قلوب واذہان کو بڑے پیمانے پر مسخر نہیں کر سکتے ——— اور جب تک جذبہ وامنگ کا عوامی سطح پر ظہور نہ ہو ہمارا مقصود، یعنی پاکستان کے مسلمانوں کا ایک بنیانِ مرصوص بن کر نا قابل تسخیر قوت کی صورت اختیار کر لینا، حاصل نہیں ہوسکتا۔

اِس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ مسلمانوں کی چودہ سو سالہ تاریخ بہت سے بدنما داغوں اور دھبوں کے باوجود بالکل ''تاریک'' نہیں ہے، اور اس کے دَوران سیاسی مدوجزر اور حکومتی سطح پر ردّ وبدل، توڑ پھوڑ اور آمدورفت کے باوصف ایک تہذیبی اور ثقافتی تسلسل موجود رہا ہے، جس میں اصل عمل دخل دو طبقوں کے اثر ونفوذ کو حاصل رہا ہے: ایک علماء کرام اور دوسرے صوفیاء عظام۔ اور خواہ مسلمانوں کے جسموں پر حکومت امراء وسلاطین کی رہی ہو اُن کے قلوب واذہان اور احساسات وجذبات پر علماء اور صوفیاء ہی کی سیادت وقیادت کا سکہ چلتا رہا ہے، اور اجتماعیات وعمرانیات پر نگاہ رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کیفیت پورے عالم اسلام کی بہ نسبت مسلمانانِ برصغیر میں شدید ترین صورت میں موجود ہے۔ اور یہاں کا مسلمان خواہ کسی خارجی جبر کے باعث یا نفس امارہ کے داخلی دباؤ کے تحت خود اس اسلام پر پوری طرح عمل پیرا اور کاربند نہ ہو جو علماء کرام پیش کرتے ہیں لیکن دل کی گہرائیوں سے قائل اُسی کا ہے۔ اور یہ صرف چودھویں صدی ہجری کے نصف کے بعد ہوا کہ مسلمانوں کی عوامی سیاست کی قیادت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلی گئی جو دین ومذہب سے کوئی گہرا عملی لگاؤ نہیں رکھتے تھے، تاہم اِس سلسلے میں بھی یہ حقیقت نا قابل تردید ہے کہ اس قیادت کو عملاً عوامی پذیرائی اُس وقت حاصل ہوئی جب اُسے مسلمہ حیثیت کے حامل مشائخ اور علماء کی معتد بہ تعداد کی تصدیق اور سند حاصل ہوگئی ——— بنابریں وہ مذہبی جذبہ جو پاکستان کے بقاودوام اور ترقی واستحکام کا ضامن بن سکتا ہے، نہ

دین و مذہب کی کسی جدید تعبیر کی بنیاد پر پیدا ہو سکتا ہے، نہ کسی نئے دانشورانہ تصور کی اساس پر۔ بلکہ اس کی پیدائش و افزائش کا کوئی امکان اگر ہے تو دین و مذہب کے صرف اور صرف اُن تصورات اور تعبیرات کی بناء پر ہے جن کی ''اسلامیت'' نہ صرف یہ کہ مسلمان عوام کے اجتماعی شعور کے نزدیک مسلم اور قابل قبول ہو بلکہ اُن کے تحت الشعور میں رچی بسی ہو، حتیٰ کہ اُن کے لاشعور تک میں نفوذ کیے ہوئے ہو۔ اور اس میں ہرگز کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ تعبیرات اور تصورات وہی ہو سکتے ہیں جنہیں علماء کی تصدیق حاصل ہو۔

اس سلسلے میں اِس خیال کو بھی دل سے نکال دیا جائے کہ علماء تو خود آپس میں دست و گریباں ہیں اور اُن کے درمیان اتنے شدید اختلافات موجود ہیں کہ خود جمع نہیں ہو سکتے تو اُن کے مصدقہ تصورات قوم کو کیسے جمع کر دیں گے؟ اِس لیے کہ اگرچہ اس حقیقت سے تو کلی انکار ممکن نہیں ہے کہ ہمارے یہاں جہاں علمائے حق معتد بہ تعداد میں موجود ہیں، وہاں ایسے ''علماءِ سوء'' کی بھی یقیناً کمی نہیں ہے جو خالصتاً ''بغیاً بَیۡنَھُمۡ '' کی بناء پر[1] یعنی آپس کی ضدم ضدا اور ایک دوسرے پر برتری اور فوقیت کے حصول کے لیے مسلمانوں کے فروعی اختلافات کو اُبھارتے ہیں اور اُنہیں آپس میں لڑا کر اپنا الوسیدھا کرتے ہیں، تاہم پاکستان کی چالیس سالہ تاریخ کے دَوران بحیثیت مجموعی علماء کرام کا کردار مثبت اور منفی دونوں اعتبارات سے یعنی مثبت طور پاکستان میں اسلامی دستور و قانون کے نفاذ و اجراء اور منفی اعتبار سے اسلام کے مسلمہ اعتقادات و تعلیمات کے خلاف اُٹھنے والے فتنوں کے سدّ باب دونوں پہلوؤں سے ہرگز مایوس کن نہیں بلکہ بحمد اللہ نہایت روشن اور تابناک رہا ہے۔

[1] یہ الفاظ قرآنِ حکیم میں چار مقامات پر باہمی جنگ و جدال اور تشتت و انتشار کے اصل سبب کی تعیین کے ضمن میں وارد ہوئے ہیں (دیکھیے سورۂ بقرہ آیت نمبر ۲۱۳، سورۂ آل عمران آیت نمبر ۱۹، سورۂ شوریٰ آیت نمبر ۱۴، اور سورۂ جاثیہ آیت نمبر ۱۷)

چنانچہ ایک جانب جب دستور سازی کے ضمن میں ایوانِ اقتدار سے یہ شوشہ چھوڑ گیا کہ پاکستان میں کس کا اسلام نافذ کیا جائے، شیعہ یا سنی کا؟ اہل حدیث کا یا حنفی کا؟ اور بریلوی کا یا دیوبندی کا؟ تو اس چیلنج کے جواب میں جملہ مکاتب فکر کے ۳۱ سربرآوردہ علماءِ کرام نے کامل اتفاق رائے کے ساتھ ۲۲ نکاتی فارمولا پیش کر کے وہ حجت قاطع قائم کر دی تھی جو اَب تک قائم ہے اور جس کا جواب بعد میں کسی سے بھی بن نہیں آیا ـــــ اِسی طرح عقیدۂ ختم نبوت کی فصیل میں نقب لگانے والوں کے خلاف ۱۹۵۳ء اور ۱۹۷۴ء میں دو بار جملہ مسلکوں اور فرقوں کے علماء کرام نے جس اتحاد و اتفاق کا ثبوت دیا وہ بھی ہماری تاریخ کا نہایت تابندہ و درخشندہ باب ہے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ بالکل یہی کیفیت ہمارے یہاں فتنۂ انکارِ حدیث کے ضمن میں بھی پائی جاتی ہے[2] ـــــ ایک اتنی ہی عظیم مثال یہ بھی ہے کہ ۱۹۶۱ء میں جب منکرین حدیث و سنت، دلدادگان اباحیت ـــــ اور قائلین نظریۂ مساوات مرد و زن کے دباؤ کے تحت سابق صدر ایوب خان نے بدنام زمانہ عائلی قوانین نافذ کیے، تو ان کے خلاف شیعہ و سنی، اہل حدیث و حنفی، اور دیوبندی و بریلوی جملہ مکاتب فکر کے بارہ چوٹی کے علماء و مجتہدین کے علاوہ جماعت اسلامی کے سربراہ اور بعض دوسرے ملی رہنماؤں نے ایک طویل تنقیدی تحریر پر دستخط ثبت کر کے فرقہ وارانہ اختلافات کے غبارے میں سے ہوا نکال کر رکھ دی تھی۔

[2] ذرا دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو ان دونوں فتنوں کے ڈانڈے باہم ملے ہوئے نظر آئیں گے۔ اِس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کی ذات مبارک پر نبوت و رسالت کا خاتمہ و تکمیل اور اُس کے لازمی منطقی نتیجے کے طور پر اب ابدالآباد تک آپؐ کی سنت کی حجیت اور آپؐ کے اتباع کا لزوم ہی تجدد پسندی اور مغرب پرستی کی راہ کے اصل پتھر ہیں، اور یہ دونوں فتنے درحقیقت ان ہی سے گلوخلاصی کی دو بظاہر قدرے مختلف صورتیں ہیں۔

ـــــ اِس پر مستزاد ہیں یہ دو مثالیں کہ اوّلاً آج سے تین چار سال قبل جب راقم کے ایک اخباری انٹرویو میں ستر و حجاب سے متعلق اسلام کے احکام بیان ہوئے

اور اُس پر ملک بھر میں اباحیت پسند اور مغرب زدہ خواتین وحضرات نے طوفان برپا کر دیا تو بلا لحاظِ مسلک ومشرب پاکستان کی ہر مسجد کے محراب ومنبر سے میری تائید میں آواز بلند ہوئی۔ اور اگرچہ جدید دانشور حضرات وخواتین نے میرے خلاف مضامین کا طومار باندھ دیا جو قومی اخبارات کے رنگین صفحات میں جلی سرخیوں اور دیدہ زیب حاشیوں کے ساتھ شائع ہوئے، لیکن بالآخر خود اِسی حلقے کے ایک نمایاں دانشور اور صحافی (جناب صفدر میر) کو یہ کہنا پڑا کہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسرار نے حصولِ مقبولیت کے فن پر بہت کتابیں پڑھی ہیں، تو اِس سے قطع نظر کہ راقم نے زندگی بھر اِس موضوع پر کوئی کتاب پڑھنا تو کجا دیکھی بھی نہیں ——— اُن کے یہ الفاظ درحقیقت مظہر ہیں اُن کے اِس اعتراف کا کہ پاکستان کے مسلمان عوام خواہ خود اُس پر پوری طرح عمل پیرا نہ ہوں، لیکن بہرحال قائل اُسی اسلام کے ہیں جسے علماء کرام کی تائید وتوثیق حاصل ہے۔ ثانیاً جب ملک میں قانونِ شہادت اور قانون قصاص ودیت کی بحث چھڑی تو اُس کے ضمن میں پھر یہ بات الم نشرح ہوگئی کہ علماء کرام اپنے تمام تر اختلافات کے علی الرغم اسلامی قانون اور اُس کی فروعات تک کے ضمن میں بالکل متحد ومتفق ہیں۔ حتیٰ کہ ایک خاص مکتب فکر کے چوٹی کے علماء نے ایک ایسے جدید دانشور کی تردید وتغلیظ میں بھی کوئی تامل نہیں کیا جو اپنے آپ کو خود اُنہی کی جانب منسوب کرتے ہیں! قصہ مختصر یہ کہ پاکستان کے مسلمان عوام کی عظیم اکثریت کو آمادۂ عمل (Motivate) کر کے اُنہیں ایک بنیانِ مرصوص اور ناقابلِ تسخیر قوت بنا دینے کی صلاحیت واستعداد صرف اُس مذہبی جذبہ میں ہے جو اسلام کے اُس تصور کی بنیاد پر اُبھرے جسے علماءِ کرام کی تصدیق وتصویب حاصل ہو۔

3- جامد مذہبیت نہیں بلکہ انقلابی دینی جذبہ

اُس مذہبی جذبے کی عرضِ ثالث (Third Dimension) جو پاکستان کے دوام واستحکام کی مؤثر ومحکم بنیاد بن سکتا ہے، یہ ہے کہ اِس میں ''جمود'' کی بجائے ''حرکت'' اور اجتماعی نظام کو جوں کا توں رکھنے، یعنی Status Quo کو Maintain کرنے کی بجائے تبدیلی اور انقلاب کی رُوح کار فرما ہو۔ اِس لیے کہ پاکستان کا داخلی انتشار اور اس کی یک جہتی وسالمیت اور باوقار اور باعزت آزادی وخود اختیاری کے خلاف خارجی یلغار دونوں کی نوعیت ایک سیلاب کی سی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ سیلاب کا مقابلہ جمود کے ذریعے نہیں کیا جاسکتا بلکہ اِس کے لیے والہانہ جذبے کی ضرورت ہے جو جوابی سیلاب کی صورت اختیار کرلے۔ بقول علامہ اقبال مرحوم: ع

''عشق خود اِک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام!''

اور الحمدللہ کہ ہمیں اس کے لیے ہرگز نہ کسی تکلف یا تصنع کی ضرورت ہے، نہ کسی جدید نظریے اور نظام کے دَر پر مرعوبانہ اور مقلدانہ دریوزہ گری کی اِحتیاج اِس لیے کہ: اولاً اسلام اپنی اصل کے اعتبار سے ہے ہی ایک انقلابی تحریک، اور یہ اِس بنا پر کہ اسلام صرف ''مذہب'' نہیں کامل ''دین'' ہے، جو صرف عقائد وعبادات اور چند معاشرتی وسماجی رسومات سے عبارت نہیں ہے، بلکہ ان سب پر مستزاد ایک کامل واکمل، متوازن ومعتدل اور عادلانہ ومنصفانہ معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام پر مشتمل ہے۔ اور از رُوئے قرآنِ حکیم بعثت محمدی علیٰ صاحبھا الصلوٰۃ والسلام کا مقصد ہی اِس نظامِ حق کا پورے نظام زندگی پر غلبہ ہے۔ بفحوائے الفاظ قرآنی:

﴿هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ [1]

یعنی ''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمدؐ) کو الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق (اسلام) کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اُسے کل کے کل دین (نظام زندگی) پر۔''

[1] (سورۂ توبہ آیت ۳۳، سورۂ فتح آیت ۲۸، اور سورۂ صف آیت ۹)

اور اسی مقصد کے حصول و تکمیل کے لیے جدوجہد اور اس کے ضمن میں بذلِ نفس اور انفاق مال کی پُر زور دعوت دیتا ہے۔ قرآن حکیم ایمان کے تمام دعویداروں کو "جہاد فی سبیل اللہ" کی فرضیت کے عنوان سے بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ؕ﴾

"اے اہل ایمان! کیا میں تمہیں وہ تجارت بتاؤں جو تمہیں عذابِ الیم سے چھٹکارا دلا دے؟ ایمان (پختہ) رکھو اللہ اور اس کے رسول ؐ پر اور جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے اموال اور جانوں کے ساتھ۔"

(سورۂ صف آیات: ۱۰/۱۱)

اور اس جہاد فی سبیل اللہ کو شرط لازم اور رکن رکین قرار دیتا ہے ایمان حقیقی کا، سورۃ الحجرات کی آیت نمبر ۱۵ کی رو سے:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝﴾

"مؤمن تو صرف وہ ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسول ؐ پر، پھر ہرگز شک میں مبتلا نہیں ہوئے اور جہاد کیا انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں کے ساتھ، صرف یہی لوگ (دعویٰ ایمان میں) سچے ہیں۔" گویا۔

میری زندگی کا مقصد ترے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں، میں اسی لیے نمازی!

کے مصداق پورے نظامِ زندگی پر اللہ کے عطا کردہ کامل سماجی و معاشی و سیاسی نظام (Socio-Politico-Economic System) کا غلبہ ہر بندۂ مومن کی زندگی کا اصل مقصد اور اُس "جہادِ زندگانی" کا اصل ہدف ہے جس کے لوازم و شرائط اور اوزار و ہتھیار ہیں: ایمان و یقین کی دولت، پیہم سعی و جہد کا مادہ اور محبت اور اخوت کی قوتِ تسخیر، بقول علامہ اقبال مرحوم: ۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں!

ثانیاً: ہم پر اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و کرم یہ ہے کہ وطن عزیز پاکستان قائم ہی دین کے اِس حرکی تصور (Dynamic Concept) پر ہوا تھا۔ چنانچہ ایک جانب پاکستان کے بانی و موسس قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے واضح طور پر یہ بھی فرمایا تھا کہ "ہم پاکستان اس لیے حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعے عہد حاضر میں اسلام کے ابدی اور زرّین اصولِ حریت و اخوت و مساواتِ انسانی (Human Freedom Fraternity and Equality) کا عملی نمونہ پیش کریں۔" (روایت بالمعنیٰ) اور ایک موقع پر پاکستان کے دستور کے بارے میں بھی ارشاد فرمایا تھا کہ "ہمارا دستور آج سے چودہ سو سال قبل قرآن کی شکل میں مدون ہو گیا تھا۔" (روایت بالمعنیٰ) اور دوسری جانب مفکر و مصور پاکستان علامہ اقبالؒ نے اپنی زندگی کے آخری ایام کی الہامی نظم "ابلیس کی مجلس شوریٰ" میں ابلیس کی زبانی ابلیسی قوتوں کو لاحق ہونے والے سب سے بڑے خطرے اور اندیشے کی نشاندہی کی تھی، یعنی ۔

عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

تو اِس کے ضمن میں علامہ مرحوم نے نہ صرف یہ کہ اسلام کے پورے سماجی، سیاسی اور اقتصادی نظام کے بنیادی اُصولوں کو دریا کو کوزے میں بند

کرنے کے انداز میں بیان کر دیا تھا، بلکہ دراصل تحریک پاکستان کا پورا ''منشور'' (Manifesto) پیش کر دیا تھا: ؂

الحذر! آئین پیغمبرؐ سے سو بار الحذر!
حافظ ناموسِ زن، مرد آزما، مرد آفریں
موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے
نے کوئی فغفور و خاقان نے گدائے رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں!
اِس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب!
پادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں!!

نہ صرف یہ بلکہ علامہ اقبال نے تو خاص طور پر موجودہ ظالمانہ اور استحصالی معاشی نظام کے استیصال اور بیخ کنی کے لیے باضابطہ ''انقلاب'' کا نعرہ بھی بلند کر دیا تھا: ؂

خواجہ از خونِ رگ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دِہ خدایاں کشت دہقاناں خراب
انقلاب! انقلاب — — — — — اے — — — — — انقلاب

اِس ضمن میں کسی کو یہ مغالطہ یا اندیشہ لاحق نہ ہو کہ اگر سرمایہ داری اور زمینداری کے خلاف انقلابی نعرہ لگایا گیا تو یہ اسلام کی بجائے کسی اور ''ازم'' کی جانب رُجوع والتفات ہوگا، اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ شخصی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے اِن دونوں کی جڑیں جس طرح اسلام کاٹتا ہے اور کوئی نظام نہیں کاٹ سکتا۔ چنانچہ ''ربوا'' کی قطعی اور مؤکد ترین حرمت کے ذریعے ''سرمایہ داری'' کی بیخ کنی ہو جاتی ہے، اگرچہ ''سرمایہ کاری'' کے لیے صحت مند فضا، یہاں تک کہ اُس کے ضمن میں مقابلہ ومسابقت تک میدان برقرار رہتا ہے۔ اسی طرح خواہ امام اعظم امام ابوحنیفہؒ اور امامِ دارالہجرت امام مالکؒ کے متفقہ فتویٰ کو اختیار کر لیا جائے کہ مزارعت (Absentee Land Lordism) کی ہر صورت حرام مطلق ہے، خواہ فقہ حنفی کے اِس فتویٰ پر عمل کر لیا جائے کہ مفتوحہ ممالک کی اراضی کسی کی انفرادی ملکیت نہیں ہوتیں بلکہ اسلامی ریاست کی اجتماعی ملکیت ہوتی ہیں، دونوں صورتوں میں جاگیرداری اور مروجہ زمینداری کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ (اپنے حالیہ سفر ابوظہبی کے موقع پر ایک اہم اور قابل اعتماد شخصیت کے ذریعے معلوم ہوا کہ ملک شام کے بعثی انقلاب سے پہلے کے دَور کے ایک صدر نے جو آج کل ابوظہبی میں جلاوطنی کی زندگی گذار رہے ہیں، اُنہیں یہ بتایا کہ شام میں ۱۹۴۵ء تک سابقہ خلافت عثمانیہ ہی کا بندوبست اراضی چل رہا تھا اور اُس کی رو سے کل اراضی بیت المال کی ملکیت تھیں۔ آئندہ وہاں جانا ہوا تو اِن شاءاللہ اُن صاحب سے خود ملاقات کر کے توثیق حاصل کروں گا۔)

''الغرض پاکستان کے بقاودوام اور اُس کی ترقی واستحکام کی واحد ممکنہ اساس وہ مذہبی جذبہ بن سکتا ہے جو قومی ونسلی نہیں بلکہ حقیقی وعملی اسلام اور اُس کی بھی کسی متجددانہ اور دانشورانہ تعبیر نہیں، بلکہ علماءِ کرام کے مصدقہ تصورات پر مبنی ہو اور نری جامد مذہبیت نہیں بلکہ ایک متحرک انقلابیت کی صورت اختیار کرے۔''

اور یہ چیز خود اسلام کے اعتبار سے بھی ''تجدد'' نہیں بلکہ صرف ''تجدید'' کا مظہر ہوگی، اور پاکستان کے نقطۂ نگاہ سے بھی کسی نئی منزل کی جانب رخ

موڑنے کی نہیں بلکہ ع

''کبھی بھولی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو!''

کے مصداق اپنے تاسیسی نظریہ و مقصد کی جانب رُجوع کے مترادف ہوگی۔ (انشاءاللہ)